باتوں کے باوجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وہ جگہ تھی جہاں کسی قسم کی بے عنوانی یا بے راہ روی کبھی پیش نہیں آئی صرف انتخابات میں ایک مرتبہ لڑکوں میں باہمی معمولی جھڑپ ہو گئی تھی پھر کیا وجہ ہے کہ واقعات کو سیدھے سادے انداز میں دیکھنے کے بجائے ان میں اتنا اپج پیچ پیدا کیا جاتا ہے کیا مسٹر چھاگلا اس کی کوئی وجہ بتلا سکتے ہیں کہ دستور دشمن اور اتحاد دشمن عناصر اس معاملہ میں اتنی گہری دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟ اور سرے سے علی گڑھ یونیورسٹی توڑ دینے کا مطالبہ کیوں کیا گیا ہے۔ کیا اخبارات میں حسب ذیل واقعات نہیں آئے

۱۔ علی یاور جنگ صاحب نے یونیورسٹی میں قدم رکھتے ہی فنی محکموں میں علی گڑھ کے لڑکوں کا داخلہ ۷۵ فی صدی سے ۵۰ فی صدی کر دیا۔ بدرالدین طیب جی سے پہلے یہ کوٹا ۶۰ فی صدی تھا کرنل بشیر حسین زیدی کے زمانہ میں اس کوٹا پر عرصہ تک بحث ہوتی رہی اور وہ بھی زائد کوٹے پر اصرار کرتے رہے اکیڈیمک کونسل میں ۳۲ ممبران ہیں جن میں ۲۸ وائس چانسلر کے ماتحت ہیں اس لیے اکیڈیمک کونسل کا فیصلہ عین وائس چانسلر کا فیصلہ ہے۔

(۱) اس سے چونکہ ہندو اور مسلمان دونوں قسم کے لڑکوں کے مفاد متاثر ہوتے تھے انھوں نے مل جل کر ایک مجلس عمل بنائی اور پُرامن طریقہ پر اپنے مطالبات پیش کیے۔ یہ مطالبہ دوسرے مطالبوں کی طرح نہ تھا یہاں براہ راست ان کے مستقبل پر زد پڑتی تھی اس لیے پرامن طریقے پر اپنی بات منوانے کی کوشش کرنا ان کا حق تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کوٹا ہرگز کم نہ ہونا چاہیے تھا اور کورٹ کے ایک ممبر کی حیثیت سے میں نے ایک تجویز بھیج دی ہے کہ کورٹ کا اسپشل جلسہ طلب کر کے اکیڈیمک کونسل کا فیصلہ رد کیا جائے اور ۷۵ فی صدی کوٹا نافذ رہنے دیا جائے۔ کیا اخبارات سے یہ واضح نہیں ہوتا ہے کہ پولیس کے آنے کے قبل تک لڑکے پرامن تھے پولیس کیوں بلائی گئی کس نے بلائی۔ مسٹر چھاگلا کے بیان میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور ہم انصاف کے نام پر سوال کرتے ہیں کہ کیوں نہیں ہے۔ چونکہ پولیس احاطہ یونیورسٹی میں بلا اجازت وائس چانسلر داخل نہیں ہو سکتی ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ وائس چانسلر نے پولیس بلائی پولیس پر خشت باری وغیرہ یا کسی ایسے حملے کا کوئی ثبوت

اخبارات سے نہیں ملتا شاید ایک لڑکے اور ایک پولیس والے سے دھکم دھکا ہو گیا اور ایک کانسٹبل گر پڑا بس پھر کیا تھا پولیس نے بلا حکم و اذن مجسٹریٹ اور بلا آنسو گیس وغیرہ کا استعمال کیے اور بلا انتباہ گولی چلا دی دو لڑکے وہیں ڈھیر ہو گئے اور غل ہو گیا کہ وہ مر گئے پھر تمام یونیورسٹی کے لڑکے ٹوٹ پڑے اور پاگل ہو گئے اور فوری اشتعال میں جو کچھ ہونا نہ چاہیے تھا وہ ہوا کیا یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ لڑکوں نے جلد اپنے جذبات پر قابو حاصل کر لیا اور جو اس سے ثابت ہے کہ جب ہوسٹل خالی کرنے کو کہا گیا تو فوراً خالی کر دیا اور جن کا نام پولیس میں دیا گیا انھوں نے خود جا کر اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ مسٹر چھاگلا نے کہیں بھی اپنے بیان میں یہ نہیں بتایا کہ ان میں سے کوئی بھی واقعہ غلط ہے۔ بس بہ ظاہر نہ تو کسی پیشگی تیاری کا سوال ہے نہ ارادۂ قتل کا۔۔۔۔ جو کچھ ہوا وہ ایک فوری جوش و اشتعال میں یہ سمجھ کر ہوا کہ وائس چانسلر نے پولیس بلوا کر دو لڑکوں کو قتل کرا دیا اور نہ کسی فرقہ وارانہ جذبہ کا سوال ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں قسم کے لڑکوں کا مستقبل متاثر ہوتا تھا اور دونوں نے مل کر ایک مظاہرہ کیا اور ساتھ ساتھ گولی کھائی۔ کیا مسٹر چھاگلا کے پاس کوئی ایسے واقعات ہیں جو ان بدیہی اور واضح شہادتوں کی مکمل تشریح کر سکیں۔

(۴) آخر میں میں عرض کروں گا کہ بدقسمتی سے میں ۲۵ اپریل کے کورٹ کے جلسہ میں موجود نہیں تھا لیکن اخبارات نے مسلسل وہ خبریں دی ہیں جو اوپر بیان کی گئیں۔ ایک عینی شاہد نے "قومی آواز" میں بالحلف بیان دیا ہے کہ اگر پولیس نہ آتی تو کسی قسم کا واقعہ رونما نہ ہوتا۔ علی گڑھ کے واقعات کے دو پہلو ہیں (۱) ایک پہلو تو وہ ہو سکتا ہے جو واقعات سے بطور نتائج برآمد ہو اور انصاف اور دیانت داری سے وہ نتیجہ نکالا جائے اور (۲) دوسرا پہلو وہ ہے جو ہندوستان کے رجعت پسند و دستور دشمن عناصر کا نقطۂ نظر ہے یہ لوگ شروع آزادی سے مسلم کلچر اور اسلامی تعلیمات کو ہندوستان سے فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ اور ان کا سب سے بڑا حملہ علی گڑھ یونیورسٹی پر ہے کیونکہ اس کے نام میں لفظ "مسلم" موجود ہے۔ اس مسلمانوں کے عظیم ادارے پر مسلمانوں کا کروڑوں روپیہ لگا ہے یہاں اسلامی تعلیمات کا ایک شعبہ ہے اور فضا میں مسلم کلچر کی نشانیاں ہیں یہ سب

دستور کے دیے ہوئے حقوق کے مطابق ہے لیکن یہی چیز ان لوگوں کو کھٹکتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس واقعہ کو بہانہ بنا کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا وجود مٹا دیں اگر مسٹر چھاگلا نادانستہ طور پر ہی سہی ان لوگوں کے ہاتھوں سے کھیل گئے تو وقتی طور پر انھیں شہرت اور ہر دلعزیزی ایک خاص طبقہ میں حاصل تو ہو جائے گی لیکن اس نیشنلزم اور سیکولرازم کا جنازہ نکل جائے گا جس کا اتنا زبردست تذکرہ چھاگلا صاحب محترم نے کیا ہے اس لیے میں چھاگلا صاحب سے مؤدبانہ درخواست کروں گا کہ وہ اپنے نظریات پر دوبارہ غور کریں۔ اور ایسا رویہ اختیار کریں جس سے عوام و خواص میں اعتماد پیدا ہو کہ انصاف ہو رہا ہے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ رجعت پسند عناصر حکومت ہند کو متاثر کرنے اور اس کو اپنے مسلک کے خلاف عمل کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

'ندائے ملت' مسلمانانِ ہند کا نہایت باوقار، متین اور بیباک اخبار ہے۔ اس نے مسلم یونیورسٹی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

جن لوگوں کی آنکھوں میں علی گڑھ یونیورسٹی کا اسلامی کردار کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے انھوں نے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۵ر اپریل کے افسوس ناک واقعہ کو یونیورسٹی کے قلب و دماغ پر ایک بھرپور وار کرنے کے لیے استعمال کرنے کا باقاعدہ فیصلہ کر لیا ہے، ورنہ اس کے خلاف نفرت اور بدگمانی کو جو فضا اس وقت اتنے انہماک کے ساتھ تیار کی جا رہی ہے اس کا محرک اور کون سا خیال اور جذبہ ہو سکتا ہے؟

اس مکتب فکر کے میر کارواں ہمارے مرکزی وزیر تعلیم شری ایم۔ سی چھاگلا ہیں جن کو بہ قول مسٹر شیو پرشاد سنہا سب سے بڑا امتیاز یہ حاصل ہے کہ پنڈت نہرو کے انتقال پر وزارت عظمیٰ کے لیے ان کا نام جن سنگھ کے ایک کارکن نے پیش کیا تھا۔ شری چھاگلا آج کل قومی دھارے میں غوطہ لگانے کے غالباً سب سے بڑے ماہر ہیں اور جیسا کہ ہونا چاہیے جب وہ اس مشق کے بعد سطح پر نمودار ہوتے ہیں تو اپنی مٹھی میں بڑے ہی انمول موتی لیے ہوتے ہیں اور اگر کسی اور سے

نہیں تو مسلمانوں سے ضرور ہی ایک وزیر بااختیار کی طرح تحکمانہ انداز میں مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کا ہار بنا کر اپنے گلے میں ڈال لیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے سلسلہ میں مسٹر چھاگلا نے جو بیانات لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں دیے ہیں ان میں جمہوری اقدار کا جو مذاق اڑایا گیا ہے وہ ہمارے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے۔ ہم یہ ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ہندوستانی شہری کی حیثیت سے کہہ رہے ہیں اس لیے کہ مسلمانوں کے لیے روحانی اذیت کا باعث بننا شری چھاگلا کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہ اسی کو اپنی سب سے بڑی خوبی سمجھتے ہیں اور اگر مسلمان اس کے خلاف کوئی احتجاج کرتے ہیں تو وہ غالباً خوش ہوتے ہیں کہ ان کا تیر نشانہ پر بیٹھا اور رقص بسمل سے لطف اندوز ہونے کا ایک اور موقع ان کے ہاتھ آ گیا۔

سرکاری تحقیقات کے مکمل ہوئے بغیر شری چھاگلا کا اتنے وثوق کے ساتھ ذاتی طور پر اخذ کیے ہوئے نتائج کا اعلان کرنے اور یہ دھمکی دینے لگنا کہ اگر تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ ان کے نزدیک قابلِ اطمینان نہ ہوئی یعنی اس نے ان کے مفروضات کی تائید نہ کی تو وہ مرکزی وزیر داخلہ کو آمادہ کریں گے کہ معاملہ کو مرکزی خفیہ پولیس کے سپرد کر دیا جائے اور ازسرِ نو تحقیقات کرائی جائے۔ یہ انداز اور یہ تیور جس خودسری اور انانیت اور جمہوری اعتبار سے جس اجڈپن کا پتہ دیتے ہیں اس کے خلاف احتجاج کرنا مسلمان ہی کا نہیں ہر باضمیر ہندوستانی کا فرض ہے۔

شری چھاگلا کے نزدیک یو۔پی حکومت کی تحقیقات کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ:

(۱) ہنگامہ فرقہ پرور عناصر کی ایما سے ہوا تھا جسے محض غیر فرقہ وارانہ رنگ دینے کی غرض سے مجلس عمل میں دو غیر مسلم طالب علموں کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔

۲۔ وائس چانسلر چونکہ غیر فرقہ پرور، آزاد اور روشن خیال شخصیت کے مالک ہیں اور وہ یونیورسٹی میں غیر فرقہ وارانہ، نامذہبی اور قوم پرستی کی فضا قائم کرنا چاہتے تھے اس لیے یونیورسٹی کے فرقہ پرست عناصر نے ان کے خلاف سازش کی۔

۳۔ اس سازش میں طلبہ ہی نہیں بلکہ یونیورسٹی کے بعض ممتاز اساتذہ بھی شریک تھے۔

۴۔ اسی طرح یونیورسٹی میں جو ہنگامہ ہوا وہ اتفاقی اور اچانک نہیں تھا بلکہ ایک منظم منصوبہ کے ماتحت تھا۔

۵۔ ہنگامہ کا مقصد وائس چانسلر جناب علی یاور جنگ کو قتل کر دینا تھا چنانچہ ہنگامہ کرنے والے اپنے ساتھ کفن بھی لائے تھے لیکن شکر ہے کہ وائس چانسلر کی جان بچ گئی جسے معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

یہ ہے وہ فرد جرم جس کی صحت اور سچائی پر شری چھاگلا کو اس قدر یقین ہے کہ اگر یو۔پی حکومت کی تحقیقاتی کمیٹی نے اس کی تصدیق نہ کی تو وہ ان کے (یعنی مرکزی حکومت کے) عدم اعتماد کا نشانہ بن جائے گی اور شری چھاگلا مرکزی تحقیقاتی ادارہ کے ذریعہ دوبارہ تحقیقات کرائیں گے اس مرکزی پیش بندی کے بعد یو۔پی حکومت کی تحقیقات کے نتائج ہمیں معلوم ہیں۔

ایک عجیب توارد یہ بھی ہے کہ یہی سب باتیں اتنی ہی قوت اور برہمی کے ساتھ شری چھاگلا کی تقریر سے دو روز قبل راشٹریہ سیوک سنگھ کے انگریزی ہفتہ وار "ارگنائزر" دہلی، کی ۲ رمئی کی اشاعت میں کہی جا چکی تھیں۔ اب معلوم نہیں کہ دونوں میں ذرائع معلومات کی یکسانیت ہے یا انداز فکر کی یا دونوں کی۔ بہرکیف مسلم یونیورسٹی کے حادثہ کے متعلق جو "اندرونی" معلومات سنگھ کے ترجمان نے بہم پہنچائی تھیں شری چھاگلا نے زیادہ تر اٹھی کو لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں اس زور شور کے ساتھ دہرایا کہ علی گڑھ سے خلوص کا تعلق رکھنے والے ہر شخص کا دل تڑپ کر رہ گیا۔

اسی اخبار نے اس بحث پر مزید گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

روس کی ملکہ کیتھرائن اعظم (وفات ۱۷۹۶ء) کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کو رعایا کی بڑی فکر رہتی تھی مگر وہ اپنے وزیر اعظم پوٹمکن کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ جب وہ رعیت کے حال چال دیکھنے دورے پر نکلتی تو وزیر اعظم پوٹمکن یہ طے کرتے کہ ملکہ کو کہاں جانا ہے۔ ملکہ کی آمد سے پہلے اس گاؤں پر لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اس کو سجا دیا جاتا۔ عوام کو نئے کپڑے تقسیم ہو جاتے اور ملکہ جب آتی تو یہ سب

دیکھ کر اس کو یقین آجاتا کہ اس کی رعایا کھانے، کپڑے، رہن سہن کے اعتبار سے خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

مغربی ممالک میں "پوٹمکن کے گاؤں" کا استعارہ اسی لیے مشہور ہے۔ یہ نمائشی، جعلی اور بے روح اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے اور جب مسلم یونیورسٹی کی موت وحیات کا سوال پیدا ہو تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس تعلیمی ادارے کو بے روح، نقلی اور جعلی بنا کر "پوٹمکن کا گاؤں" تو بنایا جا سکتا ہے کوشش بھی ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے، لیکن اس کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا ناممکن ہے۔ مراکش سے لے کر ملیشیا تک کے غیر ملکی سربراہوں کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں پیش کرنے میں مسلم یونیورسٹی کی افادیت سے بھلا کسے انکار ہو گا؟

پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں مرکزی وزیر تعلیم شری چھاگلا نے جس طرح سے یک طرفہ فیصلہ دیا، ادارے کے اندر فرقہ پرستوں کے وجود پر مہر تصدیق ثبت کی اور ان کو ادارے سے الگ کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ وہ سب کسی غیر مسلم وزیر کے بس میں نہیں تھا۔ کوئی بھی غیر مسلم وزیر ہوتا تو وہ قانون، انصاف اور شرافت کے اس بنیادی قانون کی پاسداری ضرور کرتا کہ ملزموں کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے اور الزام ثابت ہونے پر ملزم کو کسی جرم کا مرتکب قرار دیا جائے۔

بے چارے علی یاور جنگ کو اس طرح استعمال کرنے کی کوشش میں یہ بھی بیان کیا جا رہا ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں ان کی آمد ہی کے ساتھ ان کے خلاف پروپیگنڈے کی یہ مہم شروع ہو گئی تھی کہ وہ سچے مسلمان نہیں ہیں اور انھوں نے پولیس ایکشن کے بعد جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کو تباہ کیا جو اردو کی یونیورسٹی تھی۔

یہ بھی نرالی بات ہی ہے۔ جہاں تک علی یاور جنگ کے "سچے مسلمان" ہونے یا نہ ہونے کا تعلق ہے یہ مسئلہ بمشکل اٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ اسی طرح کے "ماڈرن مسلمان" ہیں جیسے بہت سے مغربی تعلیم پانے والے سرکاری عہدیدار ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کو ایک حلقہ "آزاد خیال ماہر تعلیمات" کہتا ہے لیکن اس ضمن میں ان کو بدرالدین طیب جی، کرنل زیدی، آصف علی، اصغر فیضی اور بہت سے دیگر نمایاں

"آزاد خیالوں" سے الگ کر کے ان کی صفائی یہ دینا کہ وہ "سچے مسلمان" ہیں خود ان سے ناانصافی ہو گی۔ جن لوگوں نے ان کے خلاف "سچے مسلمان" نہ ہونے کا سوال اٹھایا ہو گا ان کا مقصد جب تک واضح نہ ہو کچھ کہنا مشکل ہے بہرحال اگر یہ پروپیگنڈا ہوا ہے تو بے تکی بات ہے وائس چانسلری کے لیے ڈاکٹر ضیاء الدین سے لے کر علی یاور جنگ تک اس طرح کے "سچے مسلمان" کی شرط نہیں رہی۔ جیسے خالص مذہبی حلقوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نزدیک اگر یہ پروپیگنڈا ہوا بھی تو علی گڑھ میں لڑکوں پر اس کا شدید اثر نہیں ہو سکتا۔ علی گڑھ کوئی خالص مذہبی درسگاہ نہیں ہے جہاں عقائد و عمل کی کسوٹی پر کھوٹے کھرے کو پرکھا جائے۔ ہمیں یقین نہیں آتا کہ یہ مسئلہ علی گڑھ میں علی یاور جنگ کے خلاف ایسے اشتعال اور ہیجان کا سبب ہو سکتا ہے کہ ان پر حملہ ہو جائے۔

رہا دوسرا الزام کہ علی یاور جنگ نے جامعہ عثمانیہ کو برباد کیا تو اس کا مفہوم شاید یہ ہے کہ پولیس ایکشن کے بعد جب علی یاور جنگ جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر بنے اس وقت ذریعہ تعلیم اردو کی جگہ انگریزی کو کیا گیا۔ بات سچ ہے مگر اس کی ذمہ داری علی یاور جنگ پر کب تھی؟ پولیس ایکشن کے بعد جب وہ جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر بنے تو ان معاملات کا فیصلہ مرکز کے ہاتھ میں تھا۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد زندہ تھے اور مرکزی وزارت تعلیم مولانا آزاد ہی کے سپرد تھی۔ یہ فیصلہ بہت اعلیٰ سطح پر کیا گیا تھا کہ جامعۂ عثمانیہ سے اردو کا ذریعہ تعلیم ختم کر دیا جائے۔ مرکز کا ارادہ یہ تھا کہ اس کو دکن میں ہندی ذریعۂ تعلیم کی یونیورسٹی بنا دیا جائے گا۔ اس میں مدت درکار تھی اس لیے ذریعۂ تعلیم اردو سے انگریزی کیا گیا۔ علی یاور جنگ نے جو کچھ کیا وہ مرکز کی مرضی اور منشا کے مطابق کیا۔ ان پر الزام رکھنا بے کار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آندھرا والے جامعہ عثمانیہ کو ہندی یونیورسٹی بنانے پر تیار نہیں ہوئے اور وہاں تلگو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اردو بدنصیب بہرحال جامعہ عثمانیہ سے بیک بینی و دو گوش رخصت ہو گئی مگر اس سلسلے میں علی یاور جنگ پر کیا ذمہ داری آ سکتی ہے؟ پولیس ایکشن سے پہلے جب وہ ریاست حیدرآباد میں صدر المہام امور دستوری کے عہدے پر سرفراز تھے تو انھوں نے ریاست کے لیے ایک ایسا جمہوری

نظام، اسمبلی اور اس کے ضوابط تیار کیے تھے کہ ریاست کے ۸۵ فی صد ہندوؤں کو ۵۰ فی صد مسلمانوں کے برابر کر دیا تھا اور اس پر بھی نظام حیدر آباد کے "تحفظاتِ شاہانہ" کے تحت بہت سی مدوں میں اسمبلی کو دخل دینے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ریاست حیدر آباد کی کانگریس نے اس زمانے میں علی یاور جنگ پر جو نکتہ چینی کی تھی وہ ہر گز "۶۰ سالہ آزاد خیال ماہر تعلیمات" کی حمایت نہیں تھی مگر یہ نکتہ چینی بھی غلط تھی۔ علی یاور جنگ نظام کے نوکر تھے اور ایک نوکری پیشہ انسان زیادہ تر اوپر کی خواہش کو عملی صورت دیتا ہے اور بس۔ اس کے ذہن و فکر کے تمام عمل کا دائرہ بے حد محدود ہوتا ہے۔ اس کی ذمہ داریاں صرف اتنی ہیں کہ وہ طے شدہ پالیسی پر عمل کرتے وقت کسی گروہ کا کھلونا نہ بنے اور ایسی ناپاک گروہ بندیوں، جھگڑوں اور قواعد و ضوابط کی خلاف ورزیوں کا ارتکاب نہ کرے کہ پالیسی پر عملدرآمد سے نت نئے فتنے جاگ اٹھیں۔

اسی اخبار نے اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں اس موضوع کے متعدد پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

شری چھاگلا اپنے منصب عالی سے فائدہ اٹھا کر واقعات کا جو بھی تجزیہ چاہیں کر لیں وہ مجلس عمل میں ہندو طالب علموں کی شمولیت اور پولیس کی فائرنگ میں زخمی ہونے والے .... طلبا میں سے ایک کے ہندو ہونے پر پردہ ڈالنے میں کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ معاملہ کو غیر فرقہ وارانہ ہیئت دینے کی خاطر کچھ ہندو طالب علموں کو بھی دھوکہ دے کر شریک کر لیا گیا تھا لیکن جب تک ہندو طلبا خود یہ نہ کہیں کہ وہ مسلم فرقہ پروروں کی سازش کا شکار ہو گئے تھے اور اب وہ اپنے کیے پر پچھتا رہے ہیں کہ ان گندے اور بد طینت لوگوں کا چارہ آنکھ بند کر کے کیوں نگل گئے، اس وقت تک شری چھاگلا کی منطق سے متاثر ہونا ہمارے لیے مشکل ہے۔

دوسرا سوال یہ بھی ہے کہ آخر نواب علی یاور جنگ نے آتے ہی آتے روشن خیالی اور وسیع المنظری کی وہ کون سی اصلاحیں جاری کر دی تھیں اور یونیورسٹی کی زندگی میں کیا انقلاب لے آئے تھے جو یونیورسٹی کی "فرقہ پرست" روح تلملا کر ان کے خون کی پیاسی ہوگئی اور ان کے ساتھ وہ معاملہ کر گذری جس کی خفیف سی جھلک بھی سر شاہ سلیمان، ڈاکٹر ذاکر حسین، کرنل بشیر حسین زیدی اور مسٹر بدرالدین طیب جی کے وائس چانسلری کے زمانہ میں دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ اب یہ مان لینا ہمارے لیے ذرا دشوار ہے کہ یہ سب حضرات نواب علی یاور جنگ کے مقابلہ میں تنگ نظر، تاریک خیال اور فرقہ پرست تھے یا یونیورسٹی کے "فرقہ پرست" عناصر اپنی حماقت میں ٹڈی چھاگلا جیسے سیکولر اور قوم پرست محسن اور قومی دھارے کے یگانہ روزگار شناور کے عہد وزارت کا انتظار کرتے رہے کہ وہ سیاسی افق پر مرکزی وزیر تعلیم کی حیثیت سے ضوفشاں ہولیں تب وہ اپنی شرانگیزی کے کرتب دکھائیں اور یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجوا کر رکھ دیں۔

الغرض ٹڈی چھاگلا اور بائیں بازو کے نام نہاد ترقی پسندوں اور پارلیمنٹ اور یو۔پی ودھان سبھا کے جن سنگھی ذہنیت رکھنے والے جن سنگھ اور کانگریس کے ممبروں کی خصوصی توجہ نے خواہ مخواہ علی گڑھ کے ہنگامہ کو سیکولرازم اور فرقہ پرستی کے درمیان کا مسئلہ بنا لیا ہے اور اس طوفان میں ہنگامہ سے تعلق رکھنے والی بنیادی باتیں نظر سے اوجھل ہوگئی ہیں۔ پرانے کوٹا کی بحالی کی بابت دو رائیں یقیناً ہوسکتی ہیں لیکن بلا جھجک یہ فیصلہ صادر کر دینا کہ چونکہ اس کی وجہ سے تیسرے درجہ کے طالب علموں کو زیادہ باصلاحیت طالب علموں پر داخلہ کے معاملہ میں فوقیت حاصل ہو جاتی تھی اور اس کا اثر یونیورسٹی کے معیار تعلیم پر خراب پڑ رہا تھا اس لیے ۷۵ فی صدی کے تحفظ کو گھٹا کر ۵۰ فی صدی کر دینے کی مخالفت کو رجعت پسندی کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا کم از کم اس حکومت کے کسی رکن قطعی زیب نہیں دیتا جو جنوب کے حالیہ لسانی فسادات کے دوران میں خود اپنی طرف سے کل ہند ملازمتوں کا ریاست وار کوٹا مقرر کرنے کی پیش کش کر چکی ہو۔ درحقیقت جنوبی ریاستوں کے سارے ہنگامہ کی بنیاد وہی یہی تناسب کا مسئلہ تھا —— کل ہند ملازمتوں میں ہندی کے نفاذ کے بعد ہندی

علاقہ کے باشندوں کے مقابلہ میں غیر ہندی علاقوں کے باشندوں کی نمائندگی کا مسئلہ ـــــ اور اگر یہ چیز مدراس کے لوگوں میں اتنا شدید ہیجان پیدا کر سکتی ہے تو علی گڑھ کے طالب علموں نے اگر وائس چانسلر کے فیصلہ کے خلاف جلوس نکال لیا اور مظاہرہ کر دیا تو انھیں ناقابل معافی کیونکر ٹھہرایا جا سکتا ہے اور وہ بھی جب کہ اس طرز کی مظاہرہ بازی ہماری یونیورسٹیوں کی روایات کا ایک جزو بن چکی ہے اور ملک بھر میں شاید ہی کوئی یونیورسٹی ایسی ہو جس میں طلبا نے احتجاج کا یہ انداز اختیار نہ کیا ہو۔

جہاں تک مظاہرہ کے پُرامن ہونے کا سوال ہے کسی نے اس کی تردید نہیں کی ہے اور سب نے یہی کہا ہے کہ پولیس کے آنے سے قبل طلبا کی طرف سے ایک بھی تشدد آمیز حرکت نہیں سرزد ہوئی تھی۔ کورٹ کی میٹنگ جس ہال میں ہو رہی تھی طالب علم اس کے باہر مظاہرہ کرتے رہے اور نعرے لگاتے رہے اس وقت وائس چانسلر یا اسٹاف کے کسی سینیئر ممبر کو اس کی توفیق نہ ہوئی کہ ہال کے باہر آکر طلبا کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتے یا ان سے کہتے کہ اپنے چند نمایندے یونیورسٹی کے ذمہ داروں سے گفت و شنید کرنے کو بھیج دیں۔ ہال کے کل دروازے اور کھڑکیاں البتہ فوراً بند کر لی گئیں، اور پولیس کو ٹیلی فون کے ذریعہ طلب کر لیا گیا۔ پولیس نے وارننگ دینے یا مظاہرین کو منتشر کرنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کیے بغیر گولی چلا دی جس سے دو لڑکے زخمی ہو کر گر گئے اور طالب علموں کے مجمع میں یہ خبر دوڑ گئی کہ وہ مر گئے ہیں۔ لڑکوں کا اس پر مشتعل ہو جانا اور جو انھیں ہرگز نہ کرنا چاہیے تھا وہ کر ڈالنا ہمارے خیال میں کوئی دنیا سے نرالی بات نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ لڑکوں نے اپنے جذبات پر بہت جلد قابو پا لیا ورنہ ہم نے ایسے واقعات بھی دیکھے ہیں کہ پولیس کی فائرنگ کے بعد یونیورسٹی کے طالب علموں نے سارے شہر کے نظام کو درہم و برہم کر ڈالا۔ بسیں جلا دیں۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ ڈالے۔ سڑکوں کے بلب توڑ دیے اور ایک چھوٹی موٹی بغاوت کا منظر پیش کر دیا۔ اسی یو۔پی کی راج دھانی لکھنؤ میں کوئی پندرہ بیس برس ہوئے یونیورسٹی کے طلبا نے نظم و نسق کا اتنا بڑا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا کہ ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑو" تحریک کے دنوں میں بھی دیکھنے میں نہ آیا تھا اور محرک

اس کا بھی طالب علموں کے جلوس پر پولیس کا گولی چلا دینا ہوا تھا۔ اس کے برعکس علی گڑھ کے طلبا رجلد ہی ہوسٹلوں میں چلے گئے اور دوسرے روز جب ان سے ہوسٹل خالی کرنے کو کہا گیا تو وہ چپ چاپ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے اور جن کے خلاف پولیس کا وارنٹ تھا انھوں نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نہ صرف ایک بلند پایہ عالم دین، ہندوستان کے سب سے بڑے دینی مدرسے کے منتظم اعلیٰ اور مفکر و مدبّر ہیں بلکہ ان کے . . . . . دارالعلوم نے مولانا حسین احمد مرحوم کی سرکردگی میں ہمیشہ کانگرس کا ساتھ دیا، اور سجن و زنداں کی مصیبتیں برداشت کیں۔ مولانا نے ہوا کا رخ دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے صدر ہندوستان، وزیر اعظم، ممبران پارلیمنٹ اور دوسرے اکابر ہند کو ایک مکتوب میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مسلمانان ہند کی ایک مشترک متاع اور مایہ ناز درس گاہ ہے جس نے نازک اوقات میں زندگی کے رخ موڑے ہیں اور علم و تمدن کے میدانوں میں یادگار زمانہ کردار ادا کیا ہے۔ تقریباً کچھ کم ایک صدی کے عرصہ میں اس نے ہزاروں جوہر دل کو جنم دیا ہے جن کے مشہورِ زمانہ کارناموں کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی مخصوص روایات اور خاص مزاج رکھتی ہے جو اس کے لیے روح حیات اور وجہ تعارف ہیں اور اپنے تعلیمی معیار اور ڈسپلن کے لحاظ سے ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں میں امتیازی خوبیوں کی مالک رہی ہے۔

ایسی بلند پایہ تعلیم گاہ میں طلبہ کا ہنگامہ اور پولیس کی فائرنگ دونوں افسوس ناک ہیں۔ جہاں وائس چانسلر باپ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان پر حملہ شدید مذمت کے قابل ہے وہاں طلبہ ہماری اولاد ہیں ان کا گولیاں کھا کر گرنا ایسی بات نہیں ہے جسے بیانات پڑھ کر اس طرح نظر انداز کر دیا جائے جیسا کہ کوئی برائی نہیں ہوئی ہے۔ بلاشبہ وائس چانسلر صاحب اس حملہ کے سلسلہ میں پوری ہمدردی کے مستحق ہیں لیکن اس دردناک بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ نوجوان طلبہ جو نئی نسل کے رہنما ہیں،

گولیوں سے زخمی ہو کر گرائے گئے اور جب کہ طلبہ کے مظاہروں اور زخمی ہونے والوں میں ہندو مسلم دونوں شامل ہیں اس لیے اس موقع پر مسلمانوں کو فرقہ پرستی کا الزام دینا حقیقی تحقیقات کو مسخ کر دینا ہوگا۔ یہ کام ملک کے رہنماؤں کا ہے کہ وہ یونیورسٹی میں جائیں اور غیر جانبدارانہ سچی تحقیقات کے بعد حکومت اور عوام کو حقیقی حالات سے مطلع کریں تاکہ اس پُر وقار یونیورسٹی کا وقار اپنی جگہ بحال رہ سکے۔

پولیس کی کارگزاری پر ملک میں کافی تنقید ہو رہی ہے۔ یہ کام پولیس کے اعلیٰ حکام اور ریاستی حکومت کا ہے کہ اس سلسلے میں مناسب کارروائی کر کے رائے عامہ کو مطمئن ہونے کا موقع دیں۔ اس ملک کے فرقہ پرست رہنما اور پارٹیاں مسلم یونیورسٹی کی مخالفت پر کمربستہ ہیں کوئی وجہ نہیں ہے کہ خود ان کے رول کی بھی تحقیقات نہ کرائی جائے تاکہ یونیورسٹی قدیم اور جدید تعلیم کے مرکز اتصال ہونے کی حیثیت سے باطمینان اپنی ممتاز خصوصیتوں کے ساتھ اپنے مقاصد کو بروئے کار لاتی رہے۔ اور اس کے علمی حلقوں سے ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالمجید خواجہ مرحوم، راجہ مہندر پرتاپ اور ڈاکٹر عالم جیسے ملک و ملت اور انسانیت کے خادم پیدا ہوتے رہیں اور اس طرح ملک کے سیکولرازم کی میزان عدل کا کانٹا برابر رہے۔

اس وقت کچھ لوگ یونیورسٹی کے معاملات کو خالص قومی نقطۂ نظر اور اس کے بھی ایک تنگ اور کھنچے ہوئے دائرہ (فرقہ واریت) میں محدود کر کے طے کر دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اس ہمہ گیر یونیورسٹی سے ہماری قومی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی ساکھ وابستہ ہے جس کی ہمیشہ سے زیادہ آج ملک کو ضرورت ہے۔ میں اپیل کروں گا کہ ان معاملات کا آخری نقشہ مکمل کرنے کے لیے اونچی سطح پر ملک کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری، صدر کانگریس کامراج نادار اور یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر ملا طاہر سیف الدین صاحب کی طرف رجوع کیا جائے۔

یونیورسٹی کے اس حالیہ اور اتفاقیہ ہنگامہ آرائی کے بارہ میں ایک رخ وہ ہے جس کا اظہار مرکزی حکومت کے محکمہ تعلیمات کے رویہ سے ہو رہا ہے اور دوسرا رخ ملک و ملت کے عمائدین کی آراء

کا ہے۔ اس صورت حال نے ایک نیا موڑ پیدا کر دیا ہے جو بہی خواہان یونیورسٹی کو بلند فکری کے ساتھ اصولی انداز سے سوچنے کی دعوت دے رہا ہے۔

حکومت ہو یا قومی رہنما، یونیورسٹیوں کو ان ہنگاموں اور ان کے عوامل سے اس وقت تک نہیں بچا سکتے جب تک اخلاقی تعلیمات کے بنیادی اصولوں کو رہنمائی کے لیے قبول نہ کیا جائے۔ قانون ضابطہ حکومت اور پولیس کی مداخلت سے تعلیم گاہوں کو چلانے کا تجربہ کبھی کامیاب ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔ تعلیمی سلسلوں کو علم و عقل، دیانت و یک سوئی اور استغنا ر کی توانائی ہی سے چلایا گیا ہے۔ بالخصوص استغنا و آزادی تعلیم و تربیت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے جس کے بغیر آزاد ضمیر کی تعمیر اور آزاد دل و دماغ کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی۔ تعلیمی لائنوں میں احتیاج اور پابستگی آزاد تعلیم آزاد فکر اور علم برائے علم کے اصول میں ہمیشہ حارج اور مخل رہی ہے۔

یونیورسٹی اینٹ گارے اور اونچی عمارتوں کا نام نہیں بلکہ پُر وقار اساتذہ، ہونہار طلبہ اور بیدار مغز ارباب انتظام کے مجموعہ کا نام ہے۔ وہ استغنا کے ساتھ اپنے اعلیٰ مقاصد کو لے کر جہاں بھی بیٹھ جائیں گے وہی یونیورسٹی ہو جائے گی اس لیے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ذمہ داران یونیورسٹی وقت کی بہت سی کشمکشوں سے نجات پانے کے لیے جہاں بہت سی تدابیر کر رہے ہیں وہاں وہ اس سادہ مگر مضبوط اور محکم استغنائی اصول کو بھی نظر انداز نہ کریں کہ یونیورسٹی کے مالیات کا تعلق صرف قوم سے ہو، اور اخلاقی تعاون کا دائرہ قوم اور ملک دونوں کے لیے وسیع ہو۔ اس اصول کو عملاً اپنانے کے بعد یونیورسٹی کی تعلیمی سرگرمیاں اور تربیتی محنتیں دوراہے پر رہنے کی بجائے یکسوئی اور علم برائے علم کے استغنائی اصول پر دلوں کے اطمینان و سکون کا اعلیٰ ترین نتیجہ پیدا کر سکیں گی۔ یہ ممکن ہے کہ اس صورت میں وسائل زندگی کچھ محدود ہو جائیں لیکن یہ یقینی ہے کہ مقاصد زندگی زیادہ سے زیادہ وسیع، مضبوط اور مستحکم ہو جائیں گے۔ اگر کثرت وسائل سے مقاصد فوت ہونے لگیں تو اس سے وہ قلت وسائل بہتر ہے جس میں مقاصد کے ترقی و تحفظ کا راز مضمر ہو۔ گو میں اس کے باوجود اس گئے گذرے دور میں بھی قوم کو اتنا بے حس نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی اس متاع گرانمایہ اور اس کی قائم شدہ شان کو گنوا دینے کے لیے

آسانی سے تیار ہو جائے گی۔

اس سے ضروری تدابیر اور دوسرے دانش مندانہ اقدامات کو بے معنی بنانا مقصود نہیں بلکہ تھوڑی سی ذہنی تبدیلی کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ یونیورسٹی اپنے مقاصد کی خود مالک ہو اور انھیں بروئے کار لانے میں اسے کسی کی طرف دیکھنا نہ پڑے۔ جہاں تک ان حقوق کا تعلق ہے جو حکومت کی طرف سے یونیورسٹیوں کے لیے تسلیم کیے گئے ہیں وہ حکومت سے مالی استحصال پر موقوف نہیں بلکہ سیکولر مقاصد میں ہم آہنگی سے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کے لیے اپنی روایتی خصوصیات اور اسلامی حمیت کو پوری طرح محفوظ رکھ کر جو اس کے لیے سرمایۂ حیات ہیں سیکولر تعلیم کو اپنا لینا نہ دشوار ہے اور نہ اس کے اصول و مقاصد کے خلاف ہے۔

ضرورت ہے کہ پیش آمدہ صورت حال کو سامنے رکھ کر یونیورسٹی کے حال اور مستقبل کو طے کرنے کے لیے محترم چانسلر اور پرو وائس چانسلر کورٹ کے رسمی ممبران کے علاوہ تعلیمی ماہرین، علما، مفکرین اور ملک کے دوسرے دانشور اہل تجربہ کی مجلس مشاورت طلب کر کے مستقبل کا لائحۂ عمل طے کریں جس سے اس امتیازی شان کی یونیورسٹی کی مخصوص روایات، انداز کار، اور خاص مذاق محفوظ رہے اور وہ علم و تمدن کے راستوں سے ترقی کر کے مدارج طے کرتی رہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس یونیورسٹی، اس کے اساتذہ، طلبہ اور اس کے مخلص کارکنوں کو شرور و آفاتِ زمانہ سے محفوظ رکھ کر ملک و ملت کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔

کانگرس کے سابق جنرل سیکریٹری، گاندھی جی، اور جواہر لال کے رفیق طریق، اور رفیق زنداں، ڈاکٹر سید محمود نے بھی ایک دل ہلا دینے والا بیان شایع کر کے اپنی حکومت کو عاجلانہ اور غیر دانشمندانہ اقدام سے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا:

آج صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کرنے کے لیے ایک آرڈی ننس کا اعلان کیا ہے۔

مذکورہ آرڈی ننس کے تحت جو فوری طور پر نافذ ہو چکا ہے یونیورسٹی کا کورٹ ایک مشاورتی باڈی کی حیثیت سے کام کرے گا۔ جو وزیٹر یا یونیورسٹی کے کسی بھی حاکم کے سامنے وقتاً فوقتاً پیش کیے جانے والے امور کے سلسلے میں مشورے دے گا۔

کورٹ ۱۵ ممبران پر مشتمل ہو گا جن میں سے تیس کی نامزدگی وزیٹر کرے گا۔

ایک انتظامیہ کونسل ہو گی جو ۹ ممبران پر مشتمل ہو گی۔ اس کا چیئرمین وائس چانسلر ہو گا۔ اسے یونیورسٹی کے تمام اختیارات حاصل ہوں گے۔ ان میں ۷ ممبران کو صدر جمہوریہ وزیٹر کی حیثیت سے نامزد کریں گے۔

یہ دوسری مرکزی یونیورسٹی ہے جس کے معاملے میں صدر کو آرڈی ننس نافذ کرنا پڑا ہے۔

آرڈی ننس کے ماتحت پرو وائس چانسلر کے عہدہ کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔ لیکن اگر مجلس انتظامیہ آگے چل کر اس کی ضرورت محسوس کرے تو اسے اختیار ہے کہ وہ اس عہدہ کو برقرار رکھے۔

جب تک نئی انتظامیہ کونسل مقرر نہیں کی جاتی وائس چانسلر جو ضروری ہو گا وہ اقدام کرے گا۔ نیز جب کونسل مقرر کر دی جائے گی اسے اس کی رپورٹ پیش کرے گا۔

انتظامیہ کونسل کے تمام فیصلوں کو نامنظور کر دینے کا وزیٹر کو اختیار رہے گا۔

آج یہاں ایک پریس اعلامیہ میں بتایا گیا ہے کہ گذشتہ ۲۵ اپریل کو جو یونیورسٹی میں ہنگامے ہوئے تھے، اس کی تحقیقات کے بعد پتہ چلا کہ یہاں کچھ تشویش انگیز صورت حال پائی جاتی ہے اور غیر صحتمند اثرات بہ ظاہر یونیورسٹی کے ڈسپلن اور کارکردگی کو تباہ کر رہے ہیں۔

حکومت نے مزید یونیورسٹی کے مسائل پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا مذکورہ ہنگاموں کی وجوہات کی چھان بین کی اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ اگر یونیورسٹی اپنے فرائض کی بحسن و خوبی تکمیل کرنا چاہتی ہے اور ایک یونیورسٹی کی روایات کے مطابق تعلیمی مرکز قائم رہ سکتی ہے تو پھر اس کے نظم و نسق میں اصلاحات ضروری ہیں۔

اعلامیہ میں مزید بتایا گیا کہ حکومت نے یونیورسٹی ایکٹ کی کچھ خاص دفعات میں ترمیم کر کے

اس کا فوراً نفاذ کرنا ضروری سمجھا۔

مرکزی وزیر تعلیم مسٹر ایم۔ سی چھاگلہ نے حال ہی میں علی گڑھ کے واقعات پر تشویش کا اظہار کیا تھا اور پارلیمنٹ کو بار بار یقین دلایا تھا کہ وہ یونیورسٹی سے فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن اقدام کریں گے۔

سرکاری ذرائع کے مطابق حالانکہ بظاہر حالیہ ایجی ٹیشن داخلہ کے قوانین میں مجوزہ تبدیلیوں کے خلاف تھا۔ لیکن کافی شہادتیں حاصل ہوگئی ہیں کہ دراصل یہ ایجی ٹیشن نئے وائس چانسلر مسٹر علی یاور جنگ کے خلاف تھا جو یونیورسٹی کے مسائل کے سلسلے میں بہت ہی وسیع النظر تھے اور قوم پرستانہ رویے رکھتے تھے۔

یونیورسٹی کے ڈسپلن اور کارکردگی کو چند عناصر غیر صحت مند اثرات تباہ کر رہے تھے۔ نظم و نسق مکمل طور پر بے کار اور ناقابل اعتماد ہو چکا تھا۔ تمام تقرری فرقہ وارانہ لحاظ سے ہوئی تھی۔ ان ہی ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس طرح کی نہایت ہی محفوظ طور پر فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر کی اقلیت یونیورسٹی کے روزمرہ کے کاموں میں اپنے اثرات ڈال رہے تھے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی پاکستان کے لیے نہایت ہی ہنر مند ڈاکٹروں، اور انجینئروں کو مہیا کرنے کے لیے ایک "بھرتی" مرکز بن گئی تھی اور پاکستان کی حمایت میں سرگرمیوں کے لیے بھی ایک سرگرم مرکز تھی۔

مذکورہ ذرائع نے مزید بتایا کہ معیار تعلیم پست ہوتا جا رہا تھا اور طلبا حکام کے ساتھ ڈسپلن اور احترام نہیں برتتے تھے۔ باہر کی طاقتیں انھیں فرقہ وارانہ منافرت پر اکسا رہی تھیں جس سے یونیورسٹی کا تعلیمی ماحول مسموم ہو کر رہ گیا تھا۔

ایک اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر علی یاور جنگ نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے پھر عہدہ سنبھالنا منظور کر لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان پر مرکزی وزیر تعلیم مسٹر ایم سی چھاگلا نے بہت زور ڈالا ہے۔

اسی اثنا میں معلوم ہوا ہے کہ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر مسٹر یوسف حسین نے استعفیٰ دیدیا ہے۔

اس موقع پر علی گڑھ کے سابق وائس چانسلر اور علی گڑھ کے فرزند دلبند، اور حکومت ہند کے نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو ان کے وہ الفاظ یاد دلانا چاہتے ہیں جو انھوں نے کاشی ودیاپیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۱۴ر اگست ۱۹۳۵ء کو ارشاد فرمائے تھے:

"مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا:

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملّی وجود کو خود اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لیے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔"

اب سوال صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب، جن کی ہمارے دل میں بے انتہا عزت ہے، اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی حکومت کو یہ عاجلانہ اور غیر دانش مندانہ فیصلہ بدلنے پر آمادہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟